© rasailojaraid.com

۹

اسلاموفوبیا اور کثیر ثقافتی نظریے کی حدود

ابراہیم کالن

خلاصہ

[یورپ میں عمومی طور پر یہ تصور پایا جاتا ہے، قطع نظر اس سے کہ یہ درست ہے یا غلط، کہ اسلام اور کثیر ثقافتی نظریہ (Multiculturalism) آپس میں میل نہیں کھاتے اور مسلمانوں میں اس صلاحیت کا فقدان ہے کہ وہ کثیر ثقافتی معاشرے کا حصہ بن سکیں۔ مصنف نے اس مفروضے کی حقیقت کو سامنے لانے اور اس کی تہہ میں پوشیدہ اسلاموفوبیا اور اس پر مبنی رویّوں کو آشکار کیا ہے۔ اس کے بقول کثیر ثقافتی نظریات پر حملے بالواسطہ طور پر اسلام اور مسلمانوں پر حملے کی شکل اختیار کر چکے ہیں۔ زیرِ نظر مضمون میں مصنف نے اس صورتِ حال کے تدارک کی نظریاتی اور عملی شکلوں پر بحث کی ہے۔]

اسلام اور کثیر ثقافتی نظریے کے مابین ربطِ باہمی کی تصدیق ''اسلاموفوبیا'' کی بڑھتی ہوئی لہر سے ہوتی ہے، ایک ایسی اصطلاح جو کہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف عدم برداشت، امتیازی سلوک، بے بنیاد خوف اور نسلی تعصب کی علامت بن چکی ہے۔ یونائیٹڈ نیشنز ہائی کمشنر فار ہیومن رائٹس لوئی آربر کے بقول ''ہٹ دھرمی اور تعصب، خاص طور پر مسلمانوں کے حوالے سے یورپ میں عام رواج کی حیثیت رکھتے تھے'' اور اس نے ''مسئلے کے حل کے لیے حکومتوں پر دباؤ ڈالا ہے''۔ یورپ میں مسلمانوں کے لیے عدم برداشت کے حوالے سے سینیگال کے دودو دائینے (Doudou Diene)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی رپورٹ کی بنیاد پر اپنے تبصرے میں اضافہ کرتے ہوئے وہ کہتی ہے کہ یورپ کے لوگ ''ایک ایسے وقت میں صدمے کی کیفیت سے دوچار ہیں جب کہ یہ نکتہ عیاں کیا جاچکا ہے کہ ہٹ دھرمی، تعصب اور فرسودہ تصورات کی تکرار ابھی تک ایسے عوامل ہیں جو کہ دوسروں کے ساتھ مسلمانوں کے طرز عمل میں ابھی تک نمایاں نظر آتے ہیں''۔

ورلڈ اکنامک فورم کی ۲۰۰۸ کی رپورٹ بہ عنوان ''اسلام اینڈ دا ویسٹ: اینوال رپورٹ آن دا اسٹیٹ آف ڈائیلاگ'' میں اسلام اور مغربی معاشروں کے درمیان بڑھتے ہوئے تناؤ کو اجاگر کیا گیا ہے۔ ۲۰۰۷ میں ۲۱ ممالک میں لیے گئے ایک اہم جائزے کو بنیاد بناتے ہوئے رپورٹ میں ظاہر کیا گیا ہے کہ رائے دہندگان کی اکثریت کا یہ یقین تھا کہ اسلام اور مغرب کے درمیان تعلقات بدتر ہوتے جارہے ہیں۔ یہ امر حیران کن ہے کہ مسلمانوں کی اکثریت کے خیال میں مغرب میں اسلام کے لیے کوئی احترام نہیں پایا جاتا، جب کہ اکثر مغربی باشندوں کے نزدیک حقیقت اس کے برعکس ہے اور ان کے خیال میں مغرب کے لوگ مسلمانوں کا احترام کرتے ہیں۔[۱]

یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ یورپ اور امریکہ میں مسلمانوں کے ساتھ موجودہ طرز عمل معاملات کے پیچیدہ مجموعے کا ایک جزو ہے۔ تنوع پسندی، کثیر ثقافتی نظریے، اور مغربی معاشروں کے مستقبل جیسے موضوعات پر کسی بھی مباحثے کے اندر اسلام اور مسلمانوں کی نازک صورت حال کو موضوع بحث بنائے بغیر تبادلہ خیال نہیں کیا جاسکتا۔ یہی صورت حال عالم اسلام پر بھی صادق آتی ہے۔ ایک تیزی سے مربوط ہوتی ہوئی دنیا میں اسلاموفوبیا کو، عدم برداشت اور امتیازی سلوک کی کسی بھی اور شکل کی طرح، اس ساری صورت حال سے الگ کرکے نہیں دیکھا جاسکتا جو کہ ہمارے اردگرد واقع ہورہی ہے۔ اسلاموفوبیا نائن الیون کے واقعات کے بعد اچانک ہی وجود میں نہیں آگیا تھا۔ بہت سے پہلوؤں سے، نائن الیون کے نتیجے میں پیدا ہونے والی اذیت ناک صورت حال اس مسئلے کو محض عیاں کرنے کا سبب یا محرک بنی تھی۔ واضح طور پر اسلاموفوبیا، کثیر ثقافتی نظریے اور مسلم۔مغرب تعلقات کے اس الجھے ہوئے جال یا گتھی کے سرے نائن الیون اور امریکہ سے کہیں آگے جاملتے ہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اسلام، کثیر ثقافتی نظریہ، اور اس کے منفی عوامل (اضطراب و بے چینی)

مذہب اور جدیدیت کے درمیان تعلق کے مختلف اطوار نہ صرف یہ کہ ایک وسیع مسلمان دنیا اور مغرب کے درمیان نکتہ اختلاف کی حیثیت رکھتے ہیں بلکہ مغربی معاشروں اور وہاں رہنے والے مسلمانوں کے درمیان بھی۔ مفہوم اور جواز کی مختلف ساختیں انفرادی نمائندگی اور سماجی رویے کی تشکیل کا کام کرتی ہیں۔ اس کے باوجود ایک اہم مسئلہ اس وقت کھڑا ہو جاتا ہے جب مسلم اخلاقی ڈھانچے اور اسلامی ثقافتی طرزِ عمل کو ایک بالکل ہی منفرد لا دینی اور سیاسی تناظر کے اندر سمجھنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اگرچہ یورپ اور امریکہ کے دانش ور/علمی حلقوں کے اندر ثقافت اور انسانی نمائندگی کے تجسیم کردہ تصورات کے درمیان ایک نازک سا توازن برقرار رکھا گیا ہے، تاہم ''مسلم ثقافت کی تعریف زیادہ تر ایک ایسی جبری یا ظالمانہ طاقت کے طور پر کی گئی ہے جو نہ صرف یہ کہ مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی سوچ اور رویے پر اثر انداز ہوتی بلکہ اس کا تعین بھی کرتی ہے۔ اس طرح کی صورتوں میں ثقافت کو ایک اہم اصطلاح کے طور پر ایک ایسے انداز میں بروئے کار لایا جاتا ہے'' جو انسانی نمائندگی کی نفی کرتی ہے، افراد کی تعریف یا ان کی انفرادی شخصیت کا تعین ان کی ثقافت کی وساطت سے کرتے ہوئے اور ثقافت کو تقریباً ہر اس چیز کی وضاحت کے لیے استعمال کرتے ہوئے جو کہی یا کی جاتی ہے''۔ ثقافتی خاصیت کا حامل نسلی تعصب، مذہبی، نسلی اور ثقافتی گروہوں کے ان بھاری بھر کم قسم کے (monolithic) تصورات کے مسلط کرنے کا عمل کا نتیجہ ہوتا ہے جو ایک مرکزی قدر کے حامل ایسے نظام کے تحت متحد و منسلک نظر آتے ہیں جس میں کہ تنوع اور انسانی نمائندگی کے اظہار کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ اس کا ظہور اور استحکام بھی ثقافت کی ایسی نہاں اور عیاں درجہ بندیوں کے مجموعے کی بدولت ہوتا ہے جس میں کہ ثقافتی طرزِ عمل کے مخصوص نمونوں کو ''جدید، شہری، مہذبانہ، نجات دہندانہ اور معقولیت کا حامل ہونے'' کے طور پر شناخت کیا جاتا ہے، جب کہ دیگر کو بطور ''رجعت پسندانہ، تشدد، ہٹ دھرم خاصیت کے حامل، نامعقول اور ابہام کے حامل'' اجاگر کر دیا جاتا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ناقدین کا الزام ہے کہ کثیر ثقافتی نظریہ تمام عالمگیر معیاروں اور اقدار سے ناامید ہو جاتا ہے اور مشترکہ بنیاد سے محروم متوازی معاشروں کی تخلیق یا حوصلہ افزائی کے خطرے کا حامل ہوتا ہے۔ یہ محض خطیبانہ جوہر دکھانے کا مسئلہ نہیں ہے، کیونکہ یہ ادراک، رویوں اور پالیسی یا حکمت عملی کا تعین کرتا ہے۔ مثال کے طور پر، کیا زبردستی کی شادیوں کو، جو کہ بعض غیر مغربی طبقات آبادی میں زیر مشاہدہ آتی ہیں کثیر ثقافتی نظریات کی حکمت عملی میں شامل کیا جا سکتا ہے، یا پھر انہیں کسی اور ادارے (مثلاً قومی ریاست یا کسی عالمی ادارے) کی وساطت سے قابل قبول بنانا چاہیے تاکہ ''شہری ثقافت کے انضمام'' کی حوصلہ افزائی اور سہولت کی راہ ہموار کی جا سکے''؟ حالیہ برسوں میں یورپین حکومتوں نے بہت سی ایسی مختلف پالیسیاں اختیار کی ہیں جن کا نتیجہ شمولیت اور قبولیت کے ساتھ ہی انکار اور بیگانگی کی صورت میں بھی نکلا ہے۔ اس کا ایک ہی فیصلہ کن سبب ہے: نظریے اور پالیسی دونوں کے تحت ''ثقافت'' کا جو تصور اپنایا گیا ہے وہ زمینی حقائق سے مطابقت کا حامل ہونے میں ناکام ہو گیا ہے اور اکثر و بیشتر مغربی معاشروں کے سیکولر آزاد خیال مفروضوں اور رویوں کی عکاسی کرتا ہے۔ واضح طور پر مسلمان معاشروں کی مغرب کے اندر شمولیت اور انضمام کے حوالے سے مغربی آزاد خیالی اور مذہبی نظریات سے پاک کثیر ثقافتی نظریے کے بعض بنیادی مصروضات کا انتہائی روایت شکن جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ کثیر ثقافتی نظریات کو ہر ایک کے لیے مفید بنانے کے لیے ضروری ہے کہ رنگا رنگی یا اختلاف کو اسلام اور مسلمانوں کی شمولیت کے بغیر پذیرائی نہیں بخشی جا سکتی۔

یہ امر واضح ہے کہ رنگا رنگی، کثیر ثقافتی نظریات اور عالمگیر ثقافت کے نظریات اپنی تمام تر باریک تفریقوں سمیت کسی طرح سے بھی ایک عالمگیر معیار اور قدر کے حامل ہونے کے مقصد کے حصول میں ناکامی یا مایوسی کی طرف اشارہ کرتے نظر نہیں آتے؟ انصاف اور مساوات کے مسائل تمام تر ثقافتی تفریقوں کے باوجود عالمگیریت کے عنصر کے حامل ہیں۔ ایک ''شناخت کی سیاست'' میں، جیسا کہ چارلس ٹیلر کی اصطلاح ہے، اس قدر گنجائش ہونی چاہیے کہ ایک طرف تو ثقافتی تخصیص کے لیے کوئی درمیانی راہ نکل آئے اور دوسری طرف عالمگیر معیاری اصولوں کے مجموعے کے لیے۔ شہری ماحول میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

انضمام یا سماجی اتصال کے حوالے سے اس کا جو بھی فائدہ ہو، اس طرح کی درمیانی راہ کے لیے ضروری ہے کہ بعض ایسے مخصوص اخلاقی اصولوں کی اہمیت برقرار رکھی جائے جو عالمگیر ہونے کے ساتھ ہی مختلف ثقافتی خاصیتوں کے حامل ہیں۔

اخلاقی تخصیص بمقابلہ اخلاقی عالمگیریت کے موضوع پر مباحثے کی ایک طویل تاریخ چلی آ رہی ہے۔[۲] جو لوگ کثیر ثقافتی نظریات کا مضحکہ اڑاتے ہیں اور اسلامی اقدار کو مغربی اقدار کے ناموافق قرار دیتے ہیں، یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ مسلمان ان میزبان معاشروں کے اندر ضم ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتے جہاں وہ اقلیت میں ہوتے ہیں۔ اگرچہ ''انضمام''، ''میزبان معاشرہ'' اور ''اقلیت'' جیسی اصطلاحوں کی فیصلہ کن انداز میں تعریف کرنے کی ضرورت ہے، تاہم مسلمانوں کی اکثریت ان ناگزیر اور عالمگیر اخلاقی اقدار کے حوالے سے کم ہی اختلاف رکھتی ہے جسے وہ مسلمانوں اور مغربی معاشروں کا مشترکہ اثاثہ سمجھتی ہے۔ سنی اسلام کی تشریح کے حوالے سے انتہائی اہم سند کی حیثیت رکھنے والوں میں سے ایک شخصیت عبداللہ بن بایاح اخلاقی اضافیت کے نظریے کو مسترد کر دیتا ہے اور ایسی ''عالمگیر اقدار'' کے وجود کی توثیق کرتا ہے جو ثقافتی تخصیصات سے ماورا حیثیت رکھتی ہیں۔ اپنے استدلال کی بنیاد ''عمومی فہم'' کے وسیع تصور پر رکھتے ہوئے بن بایاح اس یقین کا اظہار کرتا ہے کہ ''مشترکہ اقدار کا وجود پایا جاتا ہے۔ اس کا بہترین ثبوت برہان و زبان کی انسانی صلاحیتیں ہیں۔ ہر عقلی ذہن انصاف کا شعور رکھتا ہے اور ہر زبان میں اس کو بیان کرنے کے لیے لفظ پایا جاتا ہے۔ یہی کچھ سچائی، آزادی، رواداری، سالمیت اور بہت سے دیگر تصورات کے بارے میں کہا جا سکتا ہے۔ ان کو ہر ثقافت میں سراہا جاتا ہے اور ہر زبان میں مثبت اظہار کیا جاتا ہے''۔

اسلاموفوبیا کا دائرہ کار

اسلاموفوبیا کی اصطلاح ۱۹۹۰ء کے عشرے میں زیر استعمال آئی تھی۔ رنی میڈ (Runneymede) کی ۱۹۹۷ء کی رپورٹ بہ عنوان اسلاموفوبیا: اے چیلنج فار اس آل (اسلاموفوبیا:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہم سب کے لیے ایک آزمائش) ۱۹۹۷ء میں برطانوی وزیر داخلہ جیک سٹرا کے ہاتھوں جاری کی گئی تھی۔ اس رپورٹ میں اسلاموفوبیا کی تعریف یوں کی گئی ہے: ''اسلام اور مسلمانوں کے لیے ایک ایسی دہشت، تنفر اور مخاصمت جسے ان نظریات کو سرایت کر کے دوام عطا کیا جاتا ہے جو مسلمانوں کے حوالے سے منفی اور توہین آمیز فرسودہ تصورات اجاگر اور منسوب کرتے ہیں''۔ رپورٹ میں اضافہ کرتے ہوئے کہا گیا کہ اسلاموفوبیا کی بنیاد ''ایک ایسے منظر/ امکان یا عالمی نظریے پر ہے جس کے باعث مسلمانوں کے لیے ایک ایسا بے بنیاد قسم کا خوف اور ناپسندیدگی جنم لیتی ہے، جس کا نتیجہ ان کو خارج کر دینے اور ان سے امتیازی سلوک روا رکھنے کی روایات کی صورت میں نکلتا ہے''۔ اس کی تعریف ان مخصوص اصطلاحوں کی روشنی میں کیئے جانے کی بدولت اسلاموفوبیا سیاست اور ترک وطن جیسے موضوعات سے لے کر اسکول اور کام کرنے کی جگہوں تک مختلف متنازعہ مسائل کے ایک پورے سلسلے میں نمایاں عنصر کی حیثیت رکھتا ہے۔

اگرچہ اسلاموفوبیا کی اصطلاح کا استعمال مختلف طریقوں سے جاری رہا، تاہم نائن الیون کے بعد پہلی اہم رپورٹ ''یورپین مانیٹرنگ سینٹر آن ریسزم اینڈ زینوفوبیا (EUMC) کی طرف سے شائع کی گئی تھی۔ ''سمری رپورٹ آن اسلاموفوبیا ان دا ای یو آفٹر نائن الیون، ۲۰۰۱ء (یورپین یونین میں گیارہ ستمبر ۲۰۰۱ء کے بعد اسلاموفوبیا پر مختصر رپورٹ)'' کے عنوان سے جاری ہونے والی اس رپورٹ میں یورپین یونین کی پندرہ رکن ریاستوں میں مسلمانوں کے خلاف امتیازی سلوک اور نسلی تعصب پر مبنی کارروائیوں کو دستاویزی شکل میں پیش کیا گیا تھا۔ رپورٹ کے نتائج سے ظاہر ہوتا تھا کہ ''اسلامی عقائد رکھنے والے طبقات اور خطرے کی زد میں آنے والے دیگر کمزور (vulnerable) طبقات ۱۱ستمبر کے بعد سے بڑھتی ہوئی مخاصمت کا شکار بن چکے ہیں۔ عام لوگوں کے اندر خوف کے بڑھتے ہوئے احساس کے باعث پہلے سے موجود تعصّبات اور بھی گہرے ہو چکے ہیں اور بہت سی یورپین رکن ریاستوں میں جارحیت اور خوف و ہراس پھیلانے والی کارروائیوں کو ہوا دی جا رہی ہے۔ اس کے ساتھ ہی بعض اوقات خوف کی شدت کم کرنے کی کوششوں کے نتیجے میں اسلامی ثقافت اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بین المذاہب ہم آہنگی کے حوالے سے عملی پیش قدمیوں میں نئی دلچسپی سامنے آئی ہے''۔

مغرب کے اسلام کے ساتھ تعلقات میں خوف کا عنصر بھی ترکی کی یورپین یونین کی رکنیت کی بعض ممالک کی جانب سے مخالفت کے دوران ابھر کر سامنے آ گیا ہے۔ اس کی ایک چونکا دینے والی ۶ مثال اس وقت مشاہدے میں آئی جب ای یو (EU) کمیشن نے ۲۰۰۴ء میں ترکی کی رکنیت کے حوالے سے پیش رفت پر ایک مثبت رپورٹ جاری کر دی تو ای۔ یو کے داخلی منڈی کے کمشنر (Internal market commissioner) فرٹس بول کینسٹا ئین نے برنارڈ لیوس کا حوالہ دیتے ہوئے یورپ کے ''یوریبیا'' بننے کے امکان کی تشویش ظاہر کی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ ''مجھے نہیں معلوم کہ یہ ایسا راستہ اختیار کرے گا، تاہم اگر اس (لیوس) کا اندازہ درست ثابت ہوتا ہے تو پھر ویانا کی ۱۶۸۳ء میں (سلطنت عثمانیہ) سے آزادی بے کار رہی ہو گی۔ کمشنر، جو کہ ویانا کے دروازوں پر سلطنت عثمانیہ کی شکست کا حوالہ دے رہا تھا، ترکی کی رکنیت کی مخالفت کے لیے بہت سی اقتصادی اور سیاسی وجوہات میں سے بھی چند ایک وجوہات کا انتخاب کر سکتا تھا، تاہم اس نے ترکی کو یورپ سے باہر دھکیلنے کے لیے واضح طور پر ثقافتی ناگزیریت پر مبنی استدلال کیا۔ اور دور دھکیلنے کا یہ عمل محض ترکی تک محدود نہیں رہا۔ اسلاموفوبیا پر مبنی کارروائیوں کا اظہار بہت سے طریقوں سے ہوتا ہے۔ بعض واضح اور عیاں ہوتی ہیں اور بعض نہاں اور مضمر۔ یہ مختلف شکلیں اختیار کرتی اور جارحیت کے مختلف درجوں کو ظاہر کرتی ہیں۔ بعض اوقات ان کا اظہار مسلمان افراد پر زبانی اور جسمانی حملوں کی صورت میں ہوتا ہے۔ اور بعض صورتوں میں مساجد، اسلامی مراکز، اور مسلمانوں کی جائیدادوں پر حملہ کر کے ان کی بے حرمتی کر دی جاتی ہے۔ جائے ملازمت، مراکز صحت، اسکولوں اور رہائشی عمارتوں میں اسلاموفوبیا تجسس، گھور کر دیکھنے، چھیڑ چھاڑ کرنے، مضحکہ اڑانے، دھتکارنے، بدنام کرنے، اور کھلم کھلا امتیازی سلوک کی شکلیں اختیار کر لیتا ہے۔ دیگر عوامی مقامات پر یہ بالواسطہ امتیازی سلوک، نفرت انگیز تقاریر، یا پھر اشیا و خدمات تک رسائی کی راہ میں رکاوٹوں کی شکل میں اظہار پاتا ہے۔

ای یو ایم سی (EUMC) کی ۲۰۰۶ء کی رپورٹ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ''ناقص ماحول یا سہولتوں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

والے رہائشی علاقوں میں مسلمانوں کی نمائندگی اکثر و بیشتر غیر متناسب ہوتی ہے، جب کہ ان کی تعلیمی کامیابی کی سطح اوسط سے بھی کم ہوتی ہے اور بے روزگاری کی شرح اوسط سے زیادہ ہوتی ہے''۔ اسی رپورٹ میں درج ذیل نکات عیاں کیے گئے ہیں:

اس امر کا وسیع ثبوت موجود ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ملازمتوں کے شعبے میں ہر درجے اور پہلو سے مسلسل امتیازی سلوک روا رکھا جاتا ہے...... یہ ثبوت آجروں کی بھرتی کی روایات (امتیازی سلوک کی آزمائش/ جانچ پرکھ) امتیازی رویوں کے حوالے سے رائے عامہ کے جائزوں اور ترک وطن کرنے والے کو محسوس ہونے والے امتیازی سلوک کے جائزوں سے اخذ کیا گیا ہے...... فراہم کردہ معلومات سے ظاہر ہوتا ہے کہ تمام تارکین وطن ملازمتوں کے حوالے سے نسلی تعصب اور امتیازی سلوک کی زد میں آنے کے خطرے کا مساوی طور پر شکار نہیں ہوتے۔ مسلمان اس خطرے کا خاص طور پر شکار نظر آتے ہیں۔

انٹرنیشنل نیلسنکی فاؤنڈیشن کی ایک رپورٹ میں یہ نکتہ آشکار کیا گیا ہے کہ جرمنی میں ''گیارہ ستمبر کے حملوں کے وقت سے ہزاروں مسلمانوں کے ذاتی کوائف واعداد وشمار کی چھان بین، مکانات کی تلاشی، تحقیق وتفتیش اور گرفتاریوں کی کارروائیاں محض اس لیے کی گئی ہیں کیونکہ ان کے بنیادی خاکے بعض مخصوص معیاروں کے مطابق ہیں، جن میں سے سب سے اہم معیار یہ ہے کہ ان کا تعلق مذہب اسلام سے ہے۔ سیاسی وفاداری کے حوالے سے پوچھ گچھ پر مبنی ازحد امتیازی سلوک کی انتہائی ڈرامائی مثال شاید جرمنی میں بیدن۔ ورٹمبرگ (Baden-Wurttemberg) کے علاقے سے ملتی ہے جہاں مسلمان تارکین وطن پر اس امر کا تعین کرنے کے لیے سوالات کی بھرمار کردی گئی کہ:

آیا درخواست گزار کی طرف سے ان آزاد خیال جمہوری اقدار کی رسمی ''قبولیت'' جو کہ جرمنی کی قومیت کے قانون کے تحت ضروری ہے، اس کے ''حقیقی عقائد'' سے مطابقت رکھتی ہے۔ تمام سوالات کو آزاد خیال جمہوریت اور اسلام کے ایک ایسے مخصوص تصور کے درمیان پائی جانے والی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دوہری یا دوشاخہ (binary) مخالفت کے معنوں میں تشکیل کیا جاتا ہے جس کے مطابق والدین کی مرضی سے ہونے والی شادی، پدرسری (باپ کی سربراہی کا) نظام، ہم جنس پرستی سے نفرت، پردہ کرنا، اور دہشت گردی کی ترغیب یا قبولیت پر زور دیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر سوال نمبر ۲۳: ''آپ نے ستمبر ۲۰۰۱ء میں نیویارک پر اور مارچ ۲۰۰۴ء میں میڈرڈ پر ہونے والے حملوں کے بارے میں سنا ہوگا۔ کیا ان حملوں کا ارتکاب کرنے والے آپ کی نظر میں دہشت گرد تھے یا مجاہدین آزادی؟''

اس طرح کی دوہری یا دوشاخہ مخالفتیں مذہبی شناخت اور قومی وفاداری کے درمیان ایک گہری خلیج متعارف کرواتی ہیں۔ اگرچہ یہ درست ہے کہ مسلمان، امت کے ساتھ ربط محسوس کرتے ہیں، جو کہ قوموں سے بالاتر مسلم شناخت ہے، تاہم ایک شخص کی مذہبی وابستگی اس سطح پر کام نہیں کرتی جس طرح کہ کسی خاص ملک کو یا وہاں موجود سیاسی نظام کو دیگر ممالک یا نظاموں پر ترجیح دینا۔ جیسا کہ رووَن ولیمز نے نکتہ عیاں کیا ہے کہ ایک مسلمان کی امہ کے ساتھ وابستگی بالکل اسی طرح سے ہوتی ہے جس طرح کہ ایک عیسائی کی چرچ کے ساتھ ہوتی ہے۔ متذکرہ مذہبی وفاداری اس سیاسی وفاداری سے مقدم ہے جو کہ ان قومی ریاستوں کو مطلوب ہوتی ہے جن میں ہم رہتے ہیں۔ مزید برآں یہ ہر طرح کے معاشروں اور اقوام کے لیے، خواہ وہ مسلم ہوں یا غیر مسلم، اکثریت میں ہوں یا اقلیت میں ایک بڑی آزمائش ہے کہ وہ اس ملک کے ساتھ وفادار رہیں جس میں وہ رہتے ہیں جب کہ اس کے ساتھ ہی انصاف اور مساوات کے ان عالمگیر اصولوں پر بھی کاربند رہیں جو قومی سرحدوں سے ماورا ہوتے ہیں۔ کثیر وفاداریوں کا مسئلہ صرف مسلمانوں کے حوالے سے ہی اٹھانا ایک طرح سے نسلی تعصب کی غمازی کرتا ہے۔ چنانچہ یورپ اور امریکہ میں بنیادی خاصیت کی حامل اسلامی سوچ کو مشتبہ سمجھا جاتا ہے اور اسی سبب سے مسترد کر دیا جاتا ہے۔ جب تک کہ یورپین شہری ہونے کے لوازمات سے گورا ہونا، عیسائی ہونا اور مذہبی نظریے کی آزادی کا علم بردار ہونا یا ان کے کسی بھی مجموعے کو شامل نہیں کر لیا جاتا اس وقت تک مسلمان کی اپنی حکومتوں کے ساتھ ناقدانہ انداز سے مصروفیت و مشغولیت کو وفاداری سے انحراف نہیں سمجھا جا سکتا۔[۳]

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مسلمانوں سے متعلق واقعات کا ذرائع ابلاغ پر یک طرفہ اور اکثر اوقات غیر ذمہ دارانہ طریقے سے احاطہ اسلاموفوبیا پر مبنی جذبات و کارروائیوں کے فروغ کا ایک اہم محرک ہے۔ مسلمان علامتوں اور شخصیات کا اکثر اوقات نہ صرف معمولی اور غیر اہم قسم کی انٹرنیٹ ویب سائٹس پر مضحکہ اور خاکہ اڑایا جاتا ہے بلکہ کبھی کبھار عوامی سطح پر مقبول اخباروں اور رسالوں میں بھی۔ اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ وابستہ منفی قسم کے فرسودہ تصورات کی تکرار کو خبروں کی نشریات، ٹی وی مباحثوں، سیاسی تقریروں اور مذہبی خطبات کا باقاعدہ حصہ بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ اسلام سے منسوب کردہ فرسودہ تصورات کی تکرار کی فہرست بہت طویل ہے، جس میں ''بھاری بھرکم، مسلط ہو جانے والا، جنسی تحریک دینے والا مبنی بر جبر، نامعقول، ہٹ دھرم، آمرانہ اور تشدد پر مائل کرنے والا شامل ہیں۔ اس طرح کے تبصرے و اصطلاحیں اگر یہودیوں، کالوں، یا کسی اور فرقے/عقیدے کے لوگوں کے لیے استعمال کی جائیں تو آج کے دور میں انہیں کوئی بھی قبول نہیں کرے گا، تاہم انہیں مسلمانوں کے حوالے سے آزادانہ استعمال کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ ذرائع ابلاغ کے ایک امریکی ماہر نے بیس برس قبل یہ نکتہ عیاں کیا تھا کہ ''آپ ایک عرب کو چوٹ لگانے کی آزادی رکھتے ہیں؛ وہ آزاد دشمن ہیں، آزاد ولن ہیں، جب کہ آپ ایک یہودی کے ساتھ ایسا نہیں کر سکتے نہ ہی کسی کالے کے ساتھ۔ جنوری ۲۰۰۴ء میں ایک یورپین صحافی نے لکھا کہ ''عرب لوگ ہماری شہری آبادیوں کو کیمیائی اور حیاتیاتی (biological) ہتھیاروں کی دہشت کا نشانہ بنا رہے ہیں۔ وہ اس امر کا عہد کر رہے ہیں کہ مغربی اور امریکی شہروں میں خودکش بمباروں کو چھوڑ دیں گے۔ وہ ہمیں دہشت زدہ کرنے کی، ہماری زندگیوں کو تعطل کا شکار کرنے کی کوشش کر رہے ہیں''۔ ستم ظریفی تو یہ ہے کہ جس صحافی نے یہ الفاظ لکھے تھے اس کو یہ یقین تھا کہ ایران ایک عرب ملک تھا۔

اس کی موجودہ شکلوں کو زیر غور لاتے ہوئے اسلاموفوبیا ایک طرح سے نسل پرستی یا نسلی تعصب کی شکل اختیار کر چکا ہے کیونکہ یہ لوگوں کے ایک اجتماع یا گروہ کو ہدف بناتا ہے اور ان کے خلاف ان کے مذہبی عقائد، ثقافتی روایات، اور نسلی پس منظر کی بنیاد پر نفرت کو ہوا دیتا ہے۔ مسلمانوں کے خلاف

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نفرت اور امتیازی سلوک میں اضافے کے بعد نسلی تعصب میں نہ صرف نسل بلکہ قومیت، زبان، ثقافت اور مذہب بیک وقت یکجا ہو جاتے ہیں۔[۴] اس مفہوم میں اسلاموفوبیا نسلی اندھا پن نہیں ہے۔ حیاتیاتی کمتری کی بنیاد کا حامل پرانا نسلی تعصب، قومیتی، ثقافتی اور مذہبی نسل پرستی کی صورت میں دوبارہ اجاگر ہو جاتا ہے۔ اسلام کی مثال میں، لڑاکا/ جنگ جو، غیر مہذب، جبری، بربریت کا حامل، آمرانہ، جنسی آزادی کے عنصر کا حامل اور پرتشدد جیسی اصطلاحات کو مسلمانوں کے مذہبی عقائد اور ثقافتی روایات کی عکاسی کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ ''نسلی لحاظ سے کمتر'' کی جگہ بتدریج ''مذہبی لحاظ سے کمتر'' نے لے لی ہے۔ اس مفہوم میں اسلاموفوبیا کو عربوں، ایشیائی اور کالے لوگوں کے لیے قومیتی اور نسلی تنفر سے علاحدہ نہیں کیا جا سکتا۔

اسلاموفوبیا کا تناظر

ثقافتی اور تہذیبی نظام کا ایک ہی مرکزی طاقت پر مبنی اور یورپ مرتکز نمونہ دنیا کے تمام شہریوں کے لیے کسی طرح بھی احساس تحفظ و احساس شمولیت کا حامل نہیں رہا۔ ایک کثیر قطبی اور کثیر مراکز کی حامل ایسی دنیا کا وجود میں آنا ضروری ہے جس کے نتیجے میں ثقافتی بیگانگی اور یورپ مرتکزیت دونوں ناپسندیدہ صورتوں کا خاتمہ ہو سکے گا۔ ایک ایسا عالمی نظام جس کی حیثیت اب فقط ''گورے آدمی کے بوجھ'' کے لیے ایک بہانے سے زیادہ نہیں رہی، امن اور تہذیبی تنوع کی روایت کو فروغ دینے کے قابل نہیں ہے۔ اسلامی اور مغربی معاشروں کے درمیان تعلقات کے مستقبل کا انحصار اب زیادہ تر ''ہم بمقابلہ وہ'' کی زبان سے ماورا ہونے کی ہماری اپنی صلاحیت پر ہوگا۔ یہ صلاحیت آگے جا کر اس حد کا تعین کرے گی جس حد تک یورپ اور امریکہ میں رہنے والے مسلمانوں کی اکثریت کے لیے یہ گنجائش پیدا ہوگی کہ وہ مغربی معاشروں کا مساوی شہریوں کے طور پر حصہ بن سکیں۔

کثیر مراکز کی حامل دنیائیں یا مرکز کے بغیر دنیا؟

ایک کثیر قطبی اور متنوع ثقافتوں کی حامل دنیا معیاری درجوں اور اقدار سے محروم دنیا نہیں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہوتی۔ یہ ایک ایسی دنیا ہوتی ہے جس میں تمام ثقافتیں اور معاشرے برابر کا درجہ رکھتے ہیں تاہم ان کا اہم مقصد مشترکہ بھلائی کے لیے جدوجہد و مسابقت کرنا ہوتا ہے۔

مسئلہ کسی حد تک ایک ''مطلق میں'' اور ایک ''مطلق وہ'' کے درمیان تنازعہ پیدا کرنے کے عمل کا نتیجہ ہوتا ہے۔ آج کے دور میں تصادم کی زبان زیادہ تر اس مخاصمانہ نمونے یا ساخت پر مبنی ہے جس کے اندر اسلام کو انصاف، مساوات، انسانی حقوق اور انسانی احترام جیسی اقدار کے مقابل رکھا جاتا ہے۔ بہت سے مسلمان بھی خالص مقامی نوعیت کی مخالفتوں، بعدازوقت قوم پرستی یا سماجی انفرادیت کے نام پر الٹی سمت میں یہی غلط کرتے ہیں۔ اپنے اور غیر کا ایک مخالفت کے طور پر تذکرے کا، تاہم، ضروری نہیں کہ نتیجہ کسی ناگزیر تصادم کی صورت میں ہی برآمد ہو۔ اپنے اور دوسرے کے درمیان فاصلے کو ایک ایسے صحت مند کھچاؤ کے طور پر بھی لیا جاسکتا ہے جس کے اندر ذات کے شعور میں وسعت اور دنیا کو ایک فرد کی حدود سے ماورا ہوکر دیکھنے کا فائدہ بھی مضمر ہے۔

واضح طور پر، ذات اور غیر ذات کے درمیان ہر قسم کی حدود کو مسمار کردینا بھی خطرناک ہے۔ اس کے نتیجے میں عدم تحفظ اور بے گھر ہونے کا ایک ایسا احساس جنم لیتا ہے جو آج کل قاہرہ کی گلیوں سے لے کر اسپین تک ہر جگہ مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔ اگرچہ عالمگیریت کے نتیجے میں ''نئے مواقعوں'' کی گنجائش بھی پیدا ہوئی ہے، تاہم اس عدم تحفظ کا احساس بھی بڑھ گیا ہے۔ یہ مسلمان ممالک میں خاص طور پر زیادہ شدت سے موجود ہے جہاں پر جدیدیت کے معدوم کر کے رکھ دینے والے اثرات کے باعث جدید دنیا کے حوالے سے عموماً اور مغرب کے حوالے سے خصوصاً عدم اعتماد اور رنج وغم کا گہرا احساس پیدا ہو چکا ہے۔ مختصر یہ کہ ذات کا ایک روایت شکن آزادانہ نظریہ صرف اور صرف ایک عدم تحفظ میں مبتلا ذات کی طرف لے جاتا ہے، اور یوں اس کے نتیجے میں بیگانگی کے احساس میں اضافہ ہو جاتا ہے۔[۵]

اس نکتے کو ذہن نشین کرنا ضروری ہے کہ بہت سے تارکین وطن، مسلم اور غیر مسلم برابر، ان

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اقدار کو ایسے مثالی تصورات کے طور پر قبول کر لیتے ہیں جن کی پیروی اکثریتی اور اقلیتی طبقات دونوں کے لیے مفروضہ طور پر ضروری ہوتی ہے۔ اختلاف اس وقت پیدا ہوتا ہے جب انہیں اقلیتی طبقوں کی ثقافتی ترجیحات کے (از سرنو) تعین اور (از سرنو) تشکیل کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ عدم اعتماد اور شک و شبے کی گہری روایات کے ساتھ یکجا ہو کر شہری ماحول میں انضمام یا مکمل طور پر انجذاب کے مطالبات کا نتیجہ یورپین مسلمانوں کی مزید بیگانگی کی صورت میں نکلتا اور انہیں مجبور کر دیتا ہے کہ وہ یورپ کی ذیلی ثقافتوں کا روپ دھار جائیں۔ تاہم، حقیقت میں، ایک جدید دنیا میں رہنے والے تمام افراد کثیر شناختیں رکھتے ہیں اور ان میں یہ صلاحیت نمایاں طور پر موجود ہے کہ اپنی شخصیت کے رنگوں اور تہوں کو کسی شناختی بحران کا شکار ہوئے بغیر ہم آہنگ کر سکیں۔ یہ صورت حال نہ صرف انفرادی شخصیت کے حوالے سے بلکہ مختلف ثقافتی طبقات کے حوالے سے بھی درست ثابت ہوتی ہے۔[6]

اگرچہ امریکہ میں اسلام اور مسلمانوں کے حوالے سے عمومی رویہ ان طویل تاریخی یادداشتوں اور گہرے ثقافتی تعصّبات کے اثرات سے پاک ہے، جن کے اثرات زیادہ تر یورپ میں نمایاں ہیں، تاہم حالیہ رجحان پریشان کن ہے۔[7] القاعدہ کی طرح کی تنظیموں کی روک تھام کے نام پر چلائی جانے والی مبنی بر نفرت مہمات خوف اور دہشت کی پالیسیوں کی راہ ہموار کر رہی ہیں۔ ''اسلامی دہشت گردی، اسلامی شدت پسندی اور اسلامی فسطائیت'' جیسی اصطلاحات سربراہان مملکت، حکام بالا، رپورٹرز، تبصرہ نگاروں، سیکولر نظریات کے علم برداروں اور مذہبی پیشواؤں کے ذخیرہ الفاظ میں جگہ بناتی نظر آ رہی ہیں۔

ادراک اور حقیقت

ہمارا ذاتی ادراک کس طرح حقیقت کا تعین کرتا ہے، اس کی ایک عمدہ مثال مسلمان ممالک میں تنازعات کا احاطہ کرنے کی ہے۔ اگرچہ پوری دنیا میں پر تشدد تنازعات کے بے شمار واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں، تاہم ذرائع ابلاغ میں سب سے زیادہ توجہ ان واقعات کو ملتی ہے جو عالم اسلام میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

رونما ہوتے ہیں۔ اس کی کچھ حد تک وجہ یہ ہے کہ ان میں سے اکثر مغربی مفادات سے وابستہ ہوتے ہیں، تاہم گہرے ثقافتی تعصب کو بھی کچھ حد تک ذمہ دار قرار دیا جا سکتا ہے۔ اگرچہ افریقہ، لاطینی امریکہ، اور ایشیا میں لاکھوں افراد کو تنازعات کے دوران بے رحمانہ اور المناک انداز میں موت کے گھاٹ اتار دیا گیا ہے جو کہ ایک قابل مذمت عمل ہے اور جسے لازماً واشگاف انداز میں مسترد کر دینا چاہیے، تاہم عمومی تاثر یہی ہے کہ زیادہ خونی فسادات ہمیشہ مسلمان ممالک میں ہوتے ہیں۔ ۲۰۰۷ء میں بیس ممالک میں رائے عامہ کے اہم جائزے کے مطابق مسلم اکثریتی ممالک میں مغربی ذرائع ابلاغ کی جانب سے سیاسی تنازعات اور فرقہ ورانہ تشدد کے واقعات کا احاطہ تعلیمی، ثقافتی، اقتصادی، ترقیاتی، شہریت کے مسائل، مذہب اور اخلاقیات کے موضوعات کی نسبت دس گنا زیادہ ہے۔ اسلامی دنیا میں سیاسی اور جنگ جو گروہوں پر توجہ دینے کے باعث مسلمانوں کی منظر کشی اس طرح کی جاتی ہے جیسے وہ سیاسی، جنگ جویانہ اور شدت پسند سرگرمیوں میں مصروف رہتے ہوں۔ اس کے برعکس عیسائیوں اور یہودیوں کو اکثر و بیشتر مذہبی سرگرمیوں کے سیاق میں پیش کیا جاتا ہے۔

مشرق وسطیٰ اور عالم اسلام میں سیاسی تنازعات کے بلا شرکت غیرے کے نتیجے میں مغرب کے عام شہری پر یہ تاثر پڑتا ہے کہ تنازعات صرف مسلمان ممالک میں ہی واقع ہوتے ہیں۔ ذرائع ابلاغ کی طرف سے فراہم کردہ اطلاعات کے نکتہ نظر سے تنازعے/ تصادم کو امن اور سمجھوتے پر ہمیشہ فوقیت دی جاتی ہے۔ تقریباً تمام عالمی ذرائع ابلاغ کی اس مشترکہ ترجیح کو سیاسی اور اخلاقی بنیادوں پر تنقید کا نشانہ بنایا جا سکتا ہے۔ اس کے باوجود ڈھانچہ جاتی (structural) مسئلہ مسلمان ممالک میں تنازعات کا احاطہ کرنے اور ''معمول کی زندگی'' بیان کرنے میں عدم توازن کے مظاہرے کا ہے۔ مثال کے طور پر، بہت سے مسلمان ممالک میں ثقافتی اور فن کارانہ سرگرمیوں کا ابلاغ کے بڑے بڑے اداروں کی طرف سے بہت کم احاطہ کیا جاتا ہے، جب کہ یہی کچھ برطانیہ اور فرانس کے حوالے سے نہیں کیا جا سکتا۔ جب تشدد کے کسی واقع کی اطلاع برطانیہ یا فرانس سے فراہم کی جاتی ہے تو اسے دوسرے سماجی، مذہبی، ثقافتی اور فن کارانہ واقعات (یعنی ایسے واقعات جو معمول کی اور مستحکم سرگرمیوں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کا احساس پیدا کرتے ہیں) کے مقابلے میں کم اہمیت دی جاتی ہے۔ تاہم جب مسلم ممالک کے حوالے سے خبروں کی غالب اکثریت کا مرکزی نکتہ تنازعات اور تشدد کی کارروائیاں ہوتی ہیں تو معمول کی زندگی اور روزمرہ کی سرگرمیوں کے احساس کا کوئی تاثر نہیں ملتا۔ اس دائمی تعصب میں مزید خطرہ یہ ہوتا ہے جسے بعض دانش وران ''اسلام کے خطرے سے خبردار کرنا'' (Securitization of Islam) کہتے ہیں، جس کے مطابق اسلام کو ایک خالص تحفظ کے نکتہ نظر سے دیکھا جاتا ہے اور اسے مغربی تہذیبوں کے وجود کو لاحق خطرے کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ اس حوالے سے جرمن ذرائع ابلاغ میں اسلامی اور مسلمان موضوعات کے احاطے پر کی گئی تحقیق، مثال کے طور پر، اس نکتے کو عیاں کرتی ہے کہ مشرق وسطیٰ میں سیاسی مسائل اور پرتشدد تنازعات پر خصوصی توجہ اس خطے کی ایک مبالغہ آمیز سیاسی منظر کشی کرتی ہے۔ اس طرح کی منظر کشی، خواہ درست جزئیات کی حامل ہونے کے ساتھ ہی ثقافتی حساسیت کے ایک مناسب درجے کو بھی عیاں کیوں نہ کرتی ہو، جرمنی میں خبروں کے رسیا عام سامعین و قارئین کے حوالے سے ایک مخصوص تناظر کے فقدان کا شکار رہوتی ہے۔ دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ مناسب سیاق یا تناظر کے بغیر نشر کیے جانے والے واقعات کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مسلمانوں کی ثقافت اور مذہب کے حوالے سے صرف سادہ جزئیات پر مبنی (مکمل و مربوط تصویر کے بغیر) اور ناگزیریت کے حامل (essentialist) قسم کے دعوے کیے جاتے ہیں اور جن کو اکثر اوقات ماہرانہ اندازوں اور گہرے تجزیوں کی شکل میں پیش کیا جاتا ہے۔ جب کہ دیگر تنازعات کا احاطہ اور تجزیہ سیاسی تنازعات کے طور پر کیا جاتا ہے، تاہم جن کا تعلق مسلمانوں سے ہو ان کا تجزیہ عموماً مسلمان رسوم، عقائد اور رواجوں کے حوالے سے کیا جاتا ہے۔ تجزیہ کار اچانک گہرائی میں جانے اور اچھی طرح چھان بین کرنے کی جانب مائل ہو جاتا ہے تا کہ پرتشدد تنازعات کے بنیادی اسباب کا احاطہ کر سکے۔

مثال کے طور پر، شمالی آئرلینڈ میں پراٹسٹنٹ۔کیتھولک تنازعے کو ہی لے لیں، جہاں کہ تنازعہ اسی قدر سیاسی ہے جتنا کہ یہ مذہبی رنگ کا حامل ہے، تاہم یہاں پر مذہب کو سیاسی تجزیے کے عنصر کے طور پر پیش نہیں کیا جاتا، دیگر عوامل میں سے، اور اس کے ساتھ اور کوئی مفہوم وابستہ نہیں کیا جاتا۔ تاہم

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

عالم اسلام کے اندر کسی تنازعے کی صورت میں سارا کا سارا استدلال ہی ایک نیا رخ اختیار کر لیتا ہے۔ اس امر کی وضاحت کے لیے مذہبی، ثقافتی، تاریخی اور حتیٰ کہ مفادیاتی (eschatalogical) تشریحیں بھی پیش کر دی جاتی ہیں کہ آخر مسلمان ثقافت کا نتیجہ پر تشدد، نامعقول، پسماندہ اور اپنی تباہی کا سامان کرنے والی کارروائیوں کی صورت میں ہی کیوں بر آمد ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر، برطانیہ میں، ان برطانوی مسلمان نو جوانوں کو جنہوں نے لندن بم دھماکوں کی منصوبہ بندی کی تھی، ''وطن میں پرورش پانے والے دہشت گرد'' قرار دے دیا جاتا ہے، جب کہ ''شمالی آئر لینڈ میں جنم لینے والے ان افراد کے حوالے سے جنہوں نے صوبے کے علاوہ مرکزی علاقے میں بھی دہشت گرد کارروائیاں جاری رکھی ہوئی ہیں'' اس طرح کی کسی عرفیت یا القاب کا استعمال نہیں کیا گیا۔

اور اس کے برعکس کبھی نہیں ہوتا۔ مشرق وسطیٰ پر نام نہاد مہارت رکھنے والے یا اسلام کا تجزیہ کرنے والے ان کاموں کی وضاحت کرنے کے لیے جو درست ہو رہے ہوتے ہیں نہ کہ غلط — کبھی بھی مسلم ثقافت کی مثبت خصوصیات بیان نہیں کرتے۔ اس کی ایک عمدہ مثال ایرانی نژاد انوشے انصاری کے خلائی سفر کا احاطہ کرنے کی ہے۔ ۱۸ ستمبر ۲۰۰۶ء کو انصاری خلا میں سفر کرنے والی پہلی مسلمان خاتون بن گئی تھی، ایک ایسا واقعہ جسے ذرائع ابلاغ میں معمولی سطح پر اجاگر کیا گیا تھا۔ اس کے باوجود انصاری کی ثقافت، مذہب یا قومیتی پس منظر کے حوالے سے کوئی مباحثہ یا تجزیہ دیکھنے میں نہیں آیا، یعنی ایسے عوامل جن کے باعث اسے اس طرح کا غیر معمولی قدم اٹھانے اور عالمی ذرائع ابلاغ میں اہم خبروں کا موضوع بننے کی تحریک ملی ہوگی۔ صورت حال اس وقت بھی مختلف نہیں تھی جب بنگلہ دیشی بینک کار محمد یونس کو غریب لوگوں کو چھوٹے چھوٹے قرضے دینے کے ایک انتہائی پر عزم اور کامیاب منصوبے کے صلے میں امن کے نوبل انعام سے نوازا گیا۔ انصاری اور اسی طرح کی بے شمار دیگر مسلم شخصیات کی طرح جنہوں نے مختلف شعبوں میں غیر معمولی کامیابی کا مظاہرہ کیا تھا، یونس کا تعلق بھی عالم اسلام سے ہے اور اس کی شخصیت کے پس منظر میں یقیناً اس معاشرے کی ثقافتی اور مذہبی تاریخ کا بھی کچھ کردار رہا ہوگا جس میں اس کی پرورش ہوئی۔ تاہم اس مرتبہ بھی، ایک مسلم بین کار

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی حیثیت سے اس کی کامیابی کے حوالے سے کسی ''ماہرانہ نکتہ نظر'' کا اظہار نہیں کیا گیا تھا۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ جب بات مسلمانوں کی ہو تو ہر بری چیز/عمل کا کوئی مذہبی سبب ہوتا ہے اور ہر اچھی چیز/عمل کے پس پردہ دیگر عوامل ہوتے ہیں۔

٦ ان ادراکات کے پس پردہ ثقافتی ربط کے فقدان کا عنصر۔ یہاں نمایاں نظر آتا ہے، اگرچہ عام مغربی قارئین کو ان کے ثقافتی اور مذہبی منظرنامے سے آگاہ رکھا جاتا ہے، مگر ان کے اسلام اور مسلمانوں کے حوالے سے نشر کی جانے والی خبروں کا ایک مناسب سیاق میں تجزیہ کرنے کے لیے درکار کم سے کم/ بنیادی علم کا فقدان ہوتا ہے۔ روزانہ کی بنیاد پر مسلم دنیا کی منفی منظرکشی کرنے والی خبروں اور تجزیوں کی بھرمار کے باعث، مغربی باشندوں میں اتنی اہلیت نہیں رہتی کہ وہ ایک معیاری اور بنیادی اسلامی نظریے اور اس سے انحراف کی شکلوں کے درمیان فرق کر سکیں۔

اس لاعلمی کا ایک پریشان کن نتیجہ دانش وروں، عوامی شخصیات اور پالیسی سازوں کی طرف سے اسلاموفوبیا کو غیر اہم موضوع قرار دینے کی صورت میں سامنے آیا ہے مسلمان افراد اور طبقات کے ساتھ ذلت آمیز، ڈرانے اور دھمکانے کے ہتھکنڈوں کا استعمال اور بعض مثالوں میں ان کے خلاف پر تشدد کارروائیوں کے ارتکاب کو اس چیز کا ردعمل قرار دے دیا جاتا ہے جسے اسلامی شدت پسندی اور دہشت گردی کا حقیقی (existential) خطرہ کہا جاتا ہے۔ اس طرح کے جواز پیش کرنے سے یہ تاثر ملتا ہے کہ مسلمانوں کے خلاف کی جانے والی پر تشدد کارروائیاں بلا سبب نہیں ہوتیں اور یوں ان کا عذر پیش کیا جا سکتا ہے۔

٧ نتیجہ نکالنے کے لیے، میں اسلاموفوبیا کے دو ایسے اثرات کا حوالہ دوں گا جن کا تعلق مسلم۔ مغرب تعلقات اور کثیر ثقافتی نظریے کے حوالے سے وسیع تر مباحث سے ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اسلاموفوبیا پر مبنی کارروائیاں مسلمانوں کو ان معاشروں کی سیاسی، سماجی، ثقافتی اور اقتصادی زندگی میں مکمل طور پر شریک ہونے سے باز رکھتی ہیں جن میں کہ وہ رہتے ہیں۔ اگرچہ مسلم طبقات پر مشتمل

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

آبادی اپنی نمائندگی کے دعوے میں ناکامی کا الزام خود اپنے سر بھی لیتی ہے، تاہم اسلاموفوبیا دوسری اور تیسری نسل کے مسلمانوں میں ظلم و زیادتی و حق تلفی کے ایک مسلسل احساس کو جنم دیتا ہے۔ اس کے باعث وہ خود کو اجنبی، الگ تھلگ اور ناپسندیدہ محسوس کرتے ہیں۔ اس کے باعث تصوراتی اور مادی دونوں حوالوں سے متوازی معاشرے جنم لیتے ہیں جس کے نتیجے میں معاشرے کے اندر مختلف قومیتی اور مذہبی طبقات آبادی کے لیے شہری ماحول اور امور میں شرکت کرنا روز بروز مشکل ہوتا جاتا ہے۔

دوسرے یہ کہ دباؤ اور خوف و ہراس کے ہتھکنڈوں کا مسلسل استعمال خود مسلمانوں کے لیے بھی تجزیہ و تنقید ذات کے دروازے بند کر دیتا ہے۔ نسلی تعصب اور اسلاموفوبیا کے عکاس رویوں پر مبنی رو بروحملوں کے پیش نظر مختلف مذہبی اور سیاسی رجحانات رکھنے والے مسلمان ساتھی مسلمانوں پر کھلے عام تنقید کرنے سے گھبراتے ہیں اور یوں انجام کار بعض ایسے انتہا پسندانہ اور نامعقول قسم کے نظریات و سرگرمیوں کا دفاع کرنے لگ جاتے ہیں جو کہ معمول کے حالات میں اسلامی ''طرز معاشرت'' سے متصادم کہہ کر مسترد کر دیے جائیں گے۔ اصل میں خدشہ یہ ہوتا ہے کہ وہ کہیں اپنے مسلمان بھائیوں اور بہنوں سے بے وفائی کے مرتکب نہ ہو جائیں۔ مسلم دنیا کی ایک انتہائی با اثر شخصیت یوسف القرضاوی کے حوالے سے سننے میں آیا ہے کہ اس نے مسلم انتہا پسندی کے مسئلے کے حل کے معاملے میں یہ کہہ کر کوئی تجویز پیش کرنے سے احتراز کیا تھا کہ ''مجھے خدشہ ہے کہ میں جو کچھ لکھ رہا ہوں، خصوصاً ان دنوں، اس کی غلط تشریح کی جا سکتی ہے، حتیٰ کہ جان بوجھ کر ایسی وضاحت بھی پیش کی جا سکتی ہے جس کے نتائج میرے اصل مقاصد کے برخلاف برآمد ہوں''۔ ایک اجتماعی احساس جرم اور فرقہ وارانہ بدنامی کے پیش نظر مسلم طبقے کے انتہائی باضمیر اور تجزیہ کار ارکان یا شخصیات بھی ایک ایسی گروہی یک جہتی میں پناہ ڈھونڈتے ہیں جو خود تنقیدی کو ایک طرح سے شکست ذات کی طرح بنا کر رکھ دیتی ہے۔

میں نے یہ استدلال پیش کیا تھا کہ کثیر ثقافتی نظریے کے حوالے سے موجودہ مباحثے کا تعلق ناگزیر طور پر اسلام اور مسلمانوں پر ہونے والے متوازی مباحثے کے ساتھ ہے۔ جدید معاشروں کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کثیر ثقافتی طرز حیات کے لیے گنجائش کی حدود اور نوعیت مسلسل سماجی اور سیاسی اداروں کے ایک وسیع مربوط سلسلے کی وساطت سے متعین ہوتی ہے۔ مغربی معاشروں اور مسلمان طبقات آبادی کے درمیان مادی اور تصوراتی حدود تہہ در تہہ حقائق اور متنوع روابط باہمی کے باعث گڈمڈ ہو چکی ہیں۔ تاہم، اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ شناخت کے دعوے جھٹلائے یا ترک کیے جا چکے ہیں۔ بلکہ دراصل ان کی اس انداز میں تشکیل و ترمیم کی جا رہی ہے جو کہ وحدانیت اور انفرادیت کے دعوؤں کو جھٹلا دیتا ہے۔ اسلامی اور مغربی معاشروں کے درمیان شناخت اور نمائندگی کی مشترکہ گنجائش جیسے جیسے باہم گڈمڈ ہوتی جا رہی ہے، ویسے ویسے وہ کچھ منظر عام پر آ رہا ہے جسے نیلوفر گول ''سرایت باہمی'' کہتی ہے، یعنی ایک ایسا عمل جو تمام متعلقہ کرداروں کو تبدیل کر کے رکھ دیتا ہے۔ کثیر ثقافتی نظریے اور اسلاموفوبیا کے تدارک پر ایک صحت مند مباحثہ صرف اسی وقت ممکن ہو سکے گا جب ہم اس قابل ہو جائیں گے کہ انجذاب یا سرایت باہمی کے اس عمل کی حدود اور عواقب کو احتیاط سے سمجھ اور تسلیم کر سکیں۔

(ترجمہ: اعزاز باقر، تلخیص: منزہ صدیقی)

Source: Ibrahim Kalin, "Islamophobia and the Limits of Multiculturalism", Chapter of a book:

John L. Esposito and Ibrahim Kalin, "Islamophobia: The Challenge of Pluralism in the 21st Century", Oxford University Press, 2011.

......حواشی......

۱۔ گیلپ کی طرف سے کیے جانے والے عالمی جائزے (World Poll) کے مطابق ''ساری دنیا کے مسلمان یہ کہتے ہیں کہ وہ ایک چیز جو کہ ان کے مغرب کے ساتھ تعلقات بہتر بنا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ مغرب مسلمانوں کے حوالے سے اپنے خیالات میں اعتدال پیدا کرے اور اسلام کا احترام کرے''۔ بحوالہ
John Esposito and Dalia Mogahed, *Who Speaks for Islam: What a Billion Muslims Really Think* (New York: Gallup Press, 2007), 61.
ایک ممتاز مسلمان محقق نے اس نکتے سے اتفاق کیا ہے: ''عالمی مسائل کے حل میں جو چیز سب سے اہم کردار ادا کر سکتی ہے وہ یہ ہے کہ تنوع/ اختلاف کا احترام کیا جائے، بلاشبہ اسے سراہا جائے، اسے فراوانی اور خوب صورتی کا ماخذ گردانا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جائے،انسانی تجربے کا ایک ناگزیر عنصر''۔

Abdallah bin Bayyah, "Shared Values" in *The State We Are In: Identity, Terror, and the Law of Jihad*, ed. Aftab Ahmad Malik (Bristol, UK: Amal, 2006).

۲۔ معاصر مسلم دنیا کو ابھی تک روایتی اسلامی تہذیب کے عالمگیر عالمانہ متن کی بازیابی کا مسئلہ درپیش ہے۔ مسلمان جدت پسند اور ان کے حمایتی ''عالمگیر'' کی عموماً وہ تعریف کرتے ہیں جو کہ روشن خیالی کے دور سے مغربی علمی روایات کے تحت اجاگر کی جاتی آرہی ہے۔''عالمگیر'' کی یہ انتہائی محدود مفہوم کی حامل تعریف واضح طور پر شناخت کی سیاست کی آئینہ دار ہے بہ نسبت کسی فیصلہ کن/تنقیدی تجزیے کے۔

حتیٰ کہ ''اے کامن ورلڈ'' (مشترکہ دنیا) جیسی پیش قدمی، جس پر پوپ نے مثبت ردعمل کا اظہار کیا ہے، اور اس کے ۲۰۰۶ء میں ترکی کے دورے اور ۲۰۰۹ میں اردن کے دورے کے بعد بھی پوپ کے اسلام اور مسلمانوں کے حوالے سے طرزِ عمل پر اکثر لوگوں کو لاحق تشویش میں کمی نہیں آئی۔

۳۔ اس امر کی ایک عمدہ مثال کہ نسلی اور مذہبی تقاضے کس طرح باہم گڈمڈ ہو کر رہ جاتے ہیں، میرل وائیں ڈیویز Merryl Wyn Davies، ویلز برطانیہ میں ایک مسلمان ہو جانے والی خاتون کی ہے۔ جب بھی کوئی صحافی اس کا انٹرویو کرتا ہے تو اس سے یہی سوال کیا جاتا ہے: ''ایک اچھی ویلش لڑکی جیسا کہ آپ ہیں، آخر کس طرح ان لڑاکا بنیاد پرستوں کا مذہب اختیار کر بیٹھی جو کہ عورتوں کو جبر کا شکار رکھتے ہیں؟''

۴۔ جیسا کہ طاہر عباس نے نکتہ کشائی کی ہے، ''نسلی شناخت دی جانے والی اقلیتوں کے حوالے سے برطانوی مباحثہ/متن میں ۱۹۵۰، ۱۹۶۰ء کی دہائی میں ''رنگ'' کی اصطلاح کی جگہ ۱۹۶۰، ۱۹۷۰ اور ۱۹۸۰ کی دہائی میں ''نسل'' کی اصطلاح نے ۱۹۹۰ کی دہائی میں ''قومیتی'' اور آج کے زمانے میں ''مہذب'' کی اصطلاح نے لے لی ہے۔

۵۔ رووَن ولیمز اسلام اور عیسائیت کے حوالے سے ''سب ایک ہی طرح کے ہیں'' کے فلسفے پر مبنی مذہبی تنوع کے خلاف دلیل دیتا ہے۔ کیونکہ یہ نہ صرف ان کے درمیان واضح دینی تفریقوں کو نظر انداز کر دیتا ہے بلکہ ''ان کے عقیدوں کے ماخذ کی تاریخی خصوصیت کے بھرپور احساس کے''، مکمل ادراک سے عاری ہونے کے ساتھ ہی ''اس عالمگیر تبلیغی/ہم جوئیانہ تقاضے'' کا فہم بھی نہیں رکھتا جو ان کی روایات سے تجسیم پاتا ہے۔

۶۔ بن بایاح کا دوبارہ حوالہ دیتے ہوئے، ''ایک شخص بیک وقت ایشیائی پس منظر کا حامل، عقیدے کی رو سے مسلمان اور برطانوی ماحول میں پرورش کردہ اور برطانوی شہریت کا حامل ہو سکتا ہے۔

۷۔ ۷مئی کو جاری کردہ گیلپ سروے کے مطابق ''امریکہ اور کینیڈا میں مذہبی اتصال اور انضمام یورپ کی نسبت کافی زیادہ ہے۔

© rasailojaraid.com